اسلامی قیادت کے بنیادی اصول، سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں

Principles of Islamic Leadership in Light of the Prophet's Seerah (ﷺ)

ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی*

ڈاکٹر ریاض احمد سعید**

Abstract:

In Islamic perspective leadership is a great feature and most important quality for achievement of national goals. Therefore, all kinds of national and organizational success are based up on quality of good leadership. Every group, society, organization, state and even the world at large need good leadership who can lead their supporters and followers and organizations towards successful physical and spiritual growth and development . It is also a fact that leadership is God gifted thing but we can enhance ability for eldership. Leadership should not be confused with the role of only those who make headlines but in essence almost everyone have sometimes somewhere, somehow played a leading role.

It is also a historical fact that the Holy Prophet Muhammad ﷺ was granted all kind of leadership and He established some important principles of Islamic leadership which are necessary to follow them for successful leadership. These principles are foundation of great achievements which are led by the Holy Prophet ﷺ. It is also observed that the Islamic Leadership principles practiced by the Holy Prophet Muhammad ﷺ and subsequently by his Caliphs and pious followers which if practiced will provide success principles equally useful both for Muslims and for non-Muslims minorities both in an Islamic state and society. In this paper the efforts are made to elaborate the guiding principles of Islamic leadership in the light of the teachings of Prophet Muhammad ﷺ.

Keywords: Islamic Leadership, Guiding Principles, Seerha of the Holy Prophet.

تمہید: قرآن حکیم نے بار بار نشاندہی کی ہے کہ انسان آدم و حوا کی اولاد ہیں اور زمین پر اللہ کا کنبہ ہیں، اسی اعتبار سے انسان فطرتاً مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے لیکن زمین میں اصلی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ وہی تنہا اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے اور اسی کو یہ

---

*Lecturer, Islamic Studies Department, National University of Modern Languages, Islamabad.

**Lecturer, Islamic Studies Department, National University of Modern Languages, Islamabad

حق پہنچتا ہے کہ اپنے بندوں کے لیے نظام زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے قانون بنائے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس پر ایک اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو زمین پر نافذ کرنے کا منصب اولوالامر کے سپرد کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری امت کے قیادت یعنی ارباب حل و عقد کی طرف منتقل ہوئی۔ وہ اس بات کے لیے مسؤل قرار پائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے احکام و قوانین نافذ کریں۔ خود بھی ان کی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی اطاعت کرائیں۔ یہ قائدین در حقیقت رسول اللہ ﷺ کے خلفاء کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾[1]

ترجمہ: ''اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے اولوالامر کی''۔

اسلام نے اپنے نظام اطاعت میں قائدین کو بلند منصب اس لیے دیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کے زمین میں نفاذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس منصب کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اسی کے قانون کو جاری و نافذ کریں۔

اس طرح ان کے منصب کا بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو خود رب کائنات کے قانون کی نافرمانی کریں اور نہ دوسروں کو کسی ایسی بات کا حکم دیں جو رب کائنات کے حکم کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں سے اطاعت کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ اس کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بندوں کا حقیقی منصب صرف اطاعت کا ہے اور اگر وہ کوئی تصرف کا حق رکھتے ہیں تو صرف اس کے نائب کی حیثیت سے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اصل حکمران کے حکم کے خلاف حکم دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو وہ اپنا وہ درجہ از خود ختم کر دیتے ہیں جو اسلام نے ان کے لیے تسلیم کیا ہے۔

قائدین کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کچھ خصوصیات کے حامل ہوں۔ مثلاً وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہوں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو دینی و قانونی سند مانتے ہوں۔ اسلام کے احکام و شرائع کے پابند ہوں۔ تہذیب و معاشرت میں اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہوں اور حلال و حرام کے بارے میں اسلام کے مقرر کی ہوئی حدود کے پابند ہوں۔ اسی لیے ایک خلیفۃ المسلمین از روئے قانون اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کو بے کم و کاست جاری کرے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔

قیادت کا معنی و مفہوم:

قیادت عربی زبان کا لفظ ہے جو قود سے لیا گیا ہے یعنی کسی کے آگے چلنا، رہبری اور راہنمائی کرنا وغیرہ، جیسے کہا جاتا ہے۔

"قيادة الجَيْش"[2]

"یعنی لشکر کی کمانڈ اور رہبری کرنا"۔

قیادت: "رہنمائی، رہبری کرنے کا عمل، سربراہی"۔[3]

قائد: "فوج کا سردار، حاکم، وہ شخص جو اندھے کا لاٹھی ہاتھ میں پکڑ کر اس کو راستے پر لے جائے"۔[4]

"آگے کی طرف کھینچنے والا، قیادت کرنے والا، افسر اعلی"۔[5]

یعنی قیادت سے مراد حکمرانی اور رہبری ہے۔ حکمران اور رہبر ایک قسم کا قائد ہے جو پوری قوم کی کشتی کو سعادت اور خوش بختی کے ساحل پر بھی لا سکتا ہے اور قوم کی بد بختی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

"قَادَ الرَّجُلُ الْفَرَسَ قَوْدًا یعنی آدمی گھوڑے کو لے کر چلا تاکہ قیادت کرے۔ وَيُسْتَعْمَلُ بِمَعْنَى الطَّاعَةِ وَالْإِذْعَانِ وَانْقَادَ فُلَانٌ لِلْأَمْرِ وَأَعْطَى الْقِيَادَ إِذَا أَذْعَنَ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا۔ قیادت اطاعت ماننے اور کسی کے ذمہ کوئی کام کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے اسے قیادت دی گئی اس کی خوشی یا مجبوری سے۔ وَقَادَ الْأَمِيرُ الْجَيْشَ قِيَادَةً فَهُوَ قَائِدٌ وَجَمْعُهُ قَادَةٌ وَقُوَّادٌ وَانْقَادَ انْقِيَادًا۔[6] امیر نے لشکر کی قیادت کی اور وہ قائد کی طرح تھے اور اس کی جمع قادۃ اور قوداد وغیرہ"۔

ایسے الفاظ جو قیادت کے لیے بولے اور استعمال کیے جاتے ہیں جن کا قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

الخلافة: "قال ابن منظور: مصدر من الفعل خلف يخلف خلافة، إذا صار في مكان ولم يصير فيه غيره. وتكون الخلافة في الخير والشر، يقال : أوصى له بالخلافة، وأحسن الولد الخلافة في إلأهل والولد، وقال: جاز أن يقال للأئمة خلفاء الله في"[7]

ابن منظور کہتے ہیں کہ یہ مصدر ہے فعل خلف سے اس کا تعلق جگہ سے ہے اور اس کے بغیر یہ کچھ بھی نہیں۔ خلافت (جانشینی) خیر اور شر دونوں کے لیے ہے اسی سے اس کو خلافت کی نصیحت کی، اپنی نیابت کے لیے اچھا بچہ گھر والوں کے لیے چھوڑا، فرماتے ہیں کہ یہ کہنا جائز ہو گا کہ علماء اللہ کے زمین میں نائب ہیں۔

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾[8]

"(ہم نے ان سے کہا) اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں نائب بنایا ہے لہذا لوگوں میں انصاف سے فیصلہ کرنا اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا ورنہ یہ بات تمہیں اللہ کی راہ سے بہکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بہک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے کیونکہ وہ روز حساب کو بھول گئے"۔

2:الملك: ”قال ابن منظور: مصدر الفعل ملك يملك ملكا ، وهو لفظ يطلق على المذكروالمؤنث كالسلطان يقال: هذا ملك الله أي عزه وسلطانه، وملكوته : سلطانه وعظمته،والملكوت من الملك، كالرهبوت من الرهبة .والفاعل منه : ملك، وجمع ملك أملاك وملوك .ويقال : ملك القوم فلاناً على أنفسهم، أي صيروه ملكاً وسيدا عليهم“[9]

مصدر ہے فعل ملك يملك اس لفظ کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے اللہ نے اس کو عزت اور حکومت دی ہے اور ملکوت ملک س ہے اور اس کا فاعل ملک ہے اور اس کی جمع ملوک اور املاک استعمال ہوتی ہے فلاں شخص کو انہوں نے اپنا سلطان مقرر کر لیا یعنی وہ سردار اور ملک بن گیا ان کے لیے۔

3:الإمارة: قال ابن منظور : ”مصدر من الفعل أمر يأمر إمارة وإمرة بالكسر، وهي السيادة والرئاسة، يقال أمر الرجل إذا صار سيداً على القوم وصار ملكاً عليهم والإمارة تبدأ من إمارة أفراد ثلاثة إلى إمارة الدولة أو الإقليم أو ما يماثله في ذلك، والأمير شخصية مختارة من قبل أفراد يرون فيه انه الأنسب والأجدر لقيادتهم“[10]

یہ فعل امر سے مصدر ہے أمر یأمر إمارة یعنی سردار اور رئیس، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کسی قوم پر سردار اور ملک مقرر کر دیا گیا ہو یہ امارت تین افراد س شروع ہوتی ہے اور صوبہ یا ملک کے لیے یا جو اس کے مثل ہو بھی بولی جاتی ہے-امیر وہ شخص ہوتا ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ ان میں سب سے زیادہ قیادت اور سرداری کا حقدار ہے۔

4:السلطان: قال ابن منظور” : السلطان الحجة والبرهان“، سلطان حجت اور دلیل کو کھا جاتا ہے جیسا کہ قران میں ارشاد ہے کہ :

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ﴾[11]

”اور ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزے اور صریح سند (نبوت) دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا“۔

”مجرى المصدر .وهو في القرآن الحجة“[12]

”یہ مصدر ہے اور قرآن مجید نے اس کے معنی حجت بیان کیے ہیں۔

﴿ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ﴾[13]

”اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل (کر بھاگ) سکتے ہو تو بھاگ دیکھو! تم انتہائی زور کے بغیر نکل نہیں سکو گے“۔

" ولذلك يقال للأمراء سلاطين لأنهم الذين تقام بهم الحجة والحقوق"

"اسی لیے امراء اور سلاطین کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حجت اور دلیل مانے جاتے ہیں"۔

5: النقیب: "قال ابن منظور:النقيب عريف القوم، والجمع نقباء، والنقيب العريف وهو شاهد القوم وضمينهم"[14]

"ابن منظور بیان کرتے ہیں عریف نگران کو کہتے ہیں اور اس کی جمع نقباء ہے، اور اسی سے نقیب قوم کا گواہ اور ضامن ہوتا ہے"۔

﴿وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا﴾[15]

"اور اللہ نے بنی اسرائیل سے بھی پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ سردار مقرر کئے"۔

"والنقيب في اللغة كالأمين والكفيل، وكان النبي قد جعل ليلة العقبة كل واحد من).الذين بايعوه نقيباً على قومه وجماعته .والنقيب هو الرئيس الأكبر"۔

"لغت میں نقیب امین اور کفیل کو کہتے ہیں، عقبہ کی رات ہر ایک کو نقیب مقرر کیا جنہوں نے آپ سے بیعت لی وہ اپنی قوم کے نقیب مقرر ہوئے۔نقیب بڑے سردار کو کہتے ہیں"۔

6:الإمامة: قال ابن منظور: وأم القوم وأم بهم تقدمهم، وهيالإمامة والإمام، كل من ائتم به قوم كانوا على الصراط المستقيم أو كانوا ضالين،إمام أمته، وعليهم جميعا الائتمام بسنته التي مضى عليها وقال منه سيدنا محمد ورئيس القوم،امامهم، والجمع أئمة[16]

"قوم کی امامت یعنی ان کی قیادت کرنا یاان س آگے چلنا، امام کے لے امامت مہیا کی گئی، جس کسی کو کسی قوم کی امامت دی، وہ سیدھی راہ پر ہو یا گمراہی پر، امت کی امامت کرنا اور تمام کا اس طریق پر جمع ہونا جو گزری ہو، اسی سے رسول ﷺ کے لیے قوم کے سردارا، رئیس اور امام بولا جاتا ہے اس کی جمع ائمہ ہے"۔

اسلام کا تصور قیادت:

نبی کریمؐ کی بعثت سے قبل دنیائے انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ ہر طرف ظلم و ستم کا بازار گرم تھا، رقص و سرور میں ڈوبے عیش پسند ناعاقبت اندیش رہ نماؤں اور بادشاہوں کو عوام کی ذرہ برابر بھی فکر نہ تھی بلکہ وہ وقتاً فوقتاً انھیں اپنے عتاب کا شکار بناتے رہتے تھے۔ مگر یہ بادل چھٹا اور آفتاب کی شکل میں ایک عظیم رہ نما نمودار ہوا جس نے لوگوں کو معرفت خداوندی کے ساتھ قیادت وسیادت کے اصول سمجھائے۔ لوگوں کے دکھ درد بانٹ کر انھیں حقیقی زندگی جینا سکھایا اور بتایا کہ بہترین انسان ہی بہتر قائدانہ کردار پیش

کر سکتا ہے۔ حقیقی قائد وہ ہے جو امانت دار، امن وامان کا خواہاں اور انسانوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہو نہ کہ عیش و عشرت کا خواہاں ہو۔ یہ بہتر قیادت عملی طور پر کیسے ممکن ہے۔ آپؐ نے اپنی پوری زندگی سے اس سوال کا جواب فراہم کیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ"[17]

"تم میں کا ہر شخص ذمہ دار ہے، ہر ایک سے اس کی رعیت کے سلسلے میں باز پرس ہو گی "۔

احساس جوابدہی کا یہی وہ محرک تھا جس نے صحابہ کرامؓ کو ذمہ دار شخصیت بنادیا، جو دنیاوالوں کے لیے نمونہ بنے۔ قوم کا سربراہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی خیر خواہی کرنا، ہر طرح کی ضرویات کا خیال رکھنا اور اس کی بہتری کی فکر کرنا، اس کی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ عین فرض منصبی ہے۔ اسے اس کا احساس ضروری ہے۔ قوم کے رہبر ورہ نما کی حیثیت ایک خادم کی سی ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس فرض منصبی کو صحیح طریقہ سے انجام دے تو رعایا اور اس کے ماتحت افراد خوشحال ہوں گے، جذبہ جانثاری کے ساتھ اپنا ہر طرح کا تعاون پیش کریں گے۔ یہ قیادت بھی ایک امانت ہے، جو اس کے اہل تک پہنچانا ضروری ہے، قرآن کا اعلان ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾[18]

ترجمہ: "مسلمانوں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تم کو نہایت ہی عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ دیکھتا ہے"۔

پھر ذمہ داروں میں اہل شخص اپنی امانت داری اور صلاحیتوں کے ذریعے اعلیٰ اصولوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ عوام کی توقع کے مطابق اپنی خدمات انجام دیتا ہے، اس کے پیش نظر جہاں احساس ذمہ داری ہے وہیں ایمان کے تقاضے بھی ہیں، آپؐ کا ارشاد ہے:

"لا ايمان لمن لا امانة له، ولا دين لمن لا عهد له"[19]

ترجمہ: "اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہ ہو اور اس شخص میں دین کا پاس ولحاظ نہیں جس کے اندر عہد کی پاس داری نہ ہو"۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃاللہ علیہ رقم طراز ہیں: "یعنی تم ان برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے (Positions of Trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیئے جو نااہل، کم ظرف، بداخلاق،

بد دیانت اور بدکار تھے نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو"[20]

لیکن اگر اس کے برعکس سربراہ خود کو قوم کا خادم تصور کرنے اور اس کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنے کے بجائے مخدوم سمجھ بیٹھے اور آرائش و آسائش کی زندگی کو مقصد بنالے تو ایسے حالات میں رعایا بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہوگی اور بسا اوقات اس سربراہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے تین باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾[21]

ترجمہ: "اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے اولوالامر کی"۔

اس اصول پر، کسی ریاست کا قیام ہی وہ امتیازی خصوصیت ہے، جو ایک عام ریاست کو اسلامی ریاست بنا دیتی ہے، اور اس اصول کی رو سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں، معاملہ قانون کی تدوین کا ہو یا نظام کی تشکیل کا، قرآن و سنت سے کبھی انحراف نہ کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے بڑی صراحت کے ساتھ، اس نوع کے انحراف کو کفر قرار دیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے:

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾[22]

ترجمہ: "اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، جسے اللہ نے نازل کیا ہے، وہی کافر ہیں"۔

قرآن مجید کی اس تصریح کے بعد، اس معاملے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا کہ مسلمانوں سے اجتماعی سطح پر کیا روش مطلوب ہے اور وہ کیا چیز ہے، جسے، اگر وہ نظر انداز کر دیں تو نعمت ایمان سے بھی محروم ہو سکتے ہیں۔

شورائی نظام قانون:

اسلام کے سیاسی قوانین کے مطابق صرف وہی قائد باضابطہ ہے جو ریاست کے مسلمان شہریوں کے مشورے سے قائم ہوا ہو۔ قرآن مجید نے اسلامی نظام ریاست کے اس بنیادی اصول کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، سورہ شوریٰ میں ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ﴾[23]

ترجمہ: " (مسلمانوں) کا نظام ان کے باہمی مشورے کی بنیاد سے چلتا ہے"۔

مشورے کے اصول کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو بھی اسی کو اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ سورہ آل عمران میں ہے:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[24]

ترجمہ: "تو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہو"۔

یہ اصول نہ صرف سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے، بلکہ خلفاے راشدین نے بھی اس روایت کو قائم رکھا۔ چنانچہ آج بھی ہم تاریخ میں اس دور کی مجالس مشورہ اور ان میں کیے گئے اختلاف واتفاق کی روداد پڑھ سکتے ہیں۔

دور رسالت میں شورائی نظام قانون سازی کی تاسیس:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ براہ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل تھی اور آپ کسی معاملے میں دوسروں سے مشورہ لینے کے محتاج نہیں تھے لیکن شورائی نظام قانون سازی اور تدبیر مملکت کے نقطہ نظر سے چونکہ ضروری تھا اس وجہ سے حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے طرز عمل سے اس کی بنیاد رکھیں اس وجہ سے آپ کو قرآن میں یہ حکم دیا گیا، صحابہؓ سے مشورہ لیتے رہنے کی مذکورہ بالا قرآنی ہدایت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اہتمام کے ساتھ عمل فرمایا اس کے متعلق ایک ایسے صحابی کی شہادت ملاحظہ ہو جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ آپؐ کی صحبت میں بسر فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

" مَا رَأَيْتُ أَحَدًا قَطُّ كَانَ أَكْثَرَ مَشُورَةً لِأَصْحَابِهِ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "[25]

ترجمہ: "کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے رہنے والا کبھی کسی شخص کو نہیں پایا"۔

شوریٰ صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب صحابہؓ کا دور آیا تو ان کے سامنے ایک طرف تو آپ کا مذکورہ بالا اسوۂ حسنہ تھا اور دوسری طرف قرآن وحدیث دونوں میں نہایت واضح ہدایت خود صحابہ کو دی گئی تھی کہ وہ کس اساس پر اپنا سیاسی نظام قائم کریں اور اس میں قانون سازی کا طریقہ کیا ہو۔ پہلے قرآنی ہدایت، اس کے بعد احادیث اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے اس کی وضاحت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس اصولی ہدایت کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی :

"أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْأَمْرِ يَحْدُثُ لَيْسَ فِي كِتَابٍ وَلَا سُنَّةٍ قَالَ: يَنْظُرُ فِيهِ الْعَابِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ"[26]

ترجمہ: "ابو سلمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملے میں مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے اس کا فیصلہ کریں"۔

چنانچہ اسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ نے نظام خلافت کی بنیاد رکھی جس میں خلیفہ کے انتخاب میں بھی جمہور مسلمین کے مشورہ کی شرط لازم ٹھہرائی اور خلافت کے فرائض کی انجام دہی میں بھی شوریٰ کو ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جو اسلام میں پہلے خلیفہ ہیں، مسلمانوں کے مشورہ عام سے خلیفہ بنے اور خلیفہ بننے کے بعد انھوں نے تمام معاملات کا فیصلہ، جن کے

بارے میں ان کو کتاب و سنت میں کوئی ہدایت نہیں ملی، ان لوگوں کے مشورے سے کیا جو جمہور مسلمین کے معتمد لیڈر تھے اور علم و دیانت کے لحاظ سے لوگوں میں بہتر خیال کیے جاتے تھے۔

دنیا نے آپ ﷺ کے تربیت یافتہ خلفائے راشدین کا دور بھی دیکھا کہ خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ امیر المومنین ہیں، بیت المال کے موجود ہوتے ہوئے بھی زندگی کس مپرسی میں گزری۔ مگر رعایا کے سرمایہ کو اپنے ذاتی مصرف میں نہیں لائے اور غیر ضروری خرچ سے گریز کرتے رہے۔ انھوں نے پوری دور اندیشی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیا۔ قیصر و کسریٰ کو فتح کرنے والے اور وسیع و عریض دنیا میں اسلام کا پرچم لہرا دینے والے خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کھجور کی چٹائی پر سوتے ہیں، جسم پر اس کے نشانات ابھر آتے ہیں۔ ان کی سادگی پر لوگوں کو معلوم کرنا پڑتا تھا کہ امیر المومنین کون ہیں؟ ان کے احساس ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ وہ رعایا کے احوال سے نہ صرف باخبر رہتے تھے بلکہ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود پیٹھ پر غلوں کا بوجھ اٹھا لیتے تھے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے قائد سرورِ عالم کو بدست خود خندق کھودتے دیکھا تھا۔

تاریخ کے اوراق کو مزید پلٹ کر دیکھیں تو تابعین میں عمر ثانی عمر بن عبد العزیز کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ انھوں نے اپنے دور خلافت میں عدل و انصاف کا وہ گراں قدر کارنامہ انجام دیا کہ سنگ والی بکری بھی بغیر سنگ کی بکری کو مارنے سے کتراتی تھی۔ جب کہ ان کی جوانی کا وہ دور (جب آپ خلیفہ مقرر نہیں ہوئے تھے) بڑے ہی ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت میں گزرا تھا۔ خوبصورت لباس، عمدہ خوشبو جسے دیکھ کر لوگ ٹھہر جاتے تھے اور گلی معطر ہو جاتی تھی۔ مگر بہ حیثیت خلیفہ خود کو خادم کی حیثیت سے پیش کیا کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عدل کا قیام:

عدل کا جو پیمانہ اسلام نے دیا ہے، دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول اور فعل سے مساوات کی بہترین مثالیں قائم فرمائیں۔ اسلام میں امیر و غریب، شاہ و گدا، اعلیٰ و ادنیٰ، آقا و غلام اور حاکم و محکوم میں کوئی فرق نہیں رکھا جاتا بلکہ اسلام تمام انسانوں کو برابر حقوق دینے کی تعلیم دیتا ہے۔

سیاسی عدل و انصاف جس کا مطلب یہ ہے کہ امورِ مملکت میں توازن و اعتدال قائم کیا جائے۔ معاشرے کے مختلف عناصر، طبقات، قبائل اور گروہوں کے ساتھ انصاف کرنا، ان کے حقوق ادا کرنا، انہیں فرائض کی ادائیگی کے لیے تیار کرنا اور ایسی فضا قائم کرنا جس میں ہر شخص یہ محسوس کرے کہ واقعی انصاف کیا جا رہا ہے، سیاسی عدل و انصاف کہلاتا ہے۔ اس سلسلے میں انفرادی یا اجتماعی اختلاف اور دشمنی کو ختم کرنے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ٱعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾[27]

"اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو یہی تقویٰ کے بہت زیادہ قریب ہے"۔

اسی عدل وانصاف اور احسان کا مظاہرہ جب حضور اکرمﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تو جانی دشمن بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اہل لغت نے اگرچہ العَدل اور العِدل کے معنی الگ الگ لیے ہیں، لیکن اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ قریب المعنی ہیں۔ عَدل معنوی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور عدل ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جن کا اِدراک حواسِ ظاہرہ سے ہوتا ہے[28]۔

عدل اصل میں عربی لفظ ہے۔ اُردو میں اس کا ہم معنی 'انصاف' انگریزی میں "Justice" اور عبرانی میں صداقاۃ اور مشپ-اط ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"سیاستِ شرعیہ کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک ہے مناصب اور عہدے اہل تر لوگوں کو دینا اور دوسرا ہے عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرنا۔ انصاف ہی پر دنیا و دین کی فلاح کا دار و مدار ہے اور بغیر عدل کے فلاحِ دارین کا حصول ناممکن ہے۔"[29]

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"العدل فهو عبارة عن الأمر المتوسط بين طرفي الإفراط والتفريط، وذلك أمر واجب الرعاية في جميع الأشياء"[30]

مندرجہ بالا تعریفات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ عدل کا مفہوم مختلف مناسبتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ عدل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے ربّ کے درمیان عدل کرے، یعنی اللہ کے حق کو اپنی خواہش پر مقدم رکھے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ عدل کرے، یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام باتوں اور چیزوں سے بچائے رکھے جن سے جسمانی و روحانی ہلاکت واذیت کا خطرہ ہو اور تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات اور مخلوق کے درمیان عدل کرے یعنی تمام مخلوقات سے ہمدردی و خیر خواہی کا برتاؤ کرے۔ ہمارے ہاں عدل کو عدالت کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔

معاشرے میں استحکام پیدا کرنے کے لیے عدل وانصاف اور سزا نہایت ضروری ہیں۔ اس کے بغیر معاشرہ جرائم اور منکرات سے پاک نہیں ہو سکتا۔ معاشرے کو برائیوں سے مبرا رکھنے کے لیے قانون وعدل نہایت ضروری ہیں۔ عدل کے بغیر، جس کی بنیاد قانون پر ہوتی ہے، امن وامان قائم نہیں رہ سکتا، اس لیے اسلام نے ایسے جرائم میں حد مقرر کی جس کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے جیسے چوری، زنا، قتل وغارت گری، لوٹ مار اور شراب نوشی وغیرہ اور انصاف اور سزا کا اختیار صرف ان لوگوں کو دیا جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو۔ قانون کے نفاذ سے جرائم کا انسداد ضروری ہو جاتا ہے اور معاشرہ کسی حد تک جرائم سے پاک بھی ہو جاتا ہے۔

قائد کے لیے لازم ہے کہ فوجداری جرائم کی سزائیں ایسی صورت حال میں نافذ کرنی چاہئیں، جب معاشرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خاطر خواہ اہتمام موجود ہو اور حالات معمول پر ہوں۔ جب تک معاشرہ میں نفاذِ اسلام کے لیے ساز گار حالات پیدا نہ کر دیئے جائیں یا یہ کہ حالات ایسے غیر معمولی ہوں جن میں ارتکابِ جرم کے محرکات ترقی پذیر ہوں تو سزاؤں کی کے نفاذ سے پہلے جرم کی روک تھام پر توجہ دینا ضروری ہے۔ چنانچہ خاص جنگی یا غیر معمولی حالات میں سزائوں کے وقتی التوا کی گنجائش بھی موجود ہے جیسا کہ قحط کے زمانے میں خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے وقتی طور پر چوری کے لیے قطع ید کی سزا التوا میں ڈال دی تھی۔

شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلہ: قائد پر لازم ہے کہ وہ صرف قانونِ الٰہی یعنی قرآن اور سنت کے مطابق فیصلہ کرے اور عدل و انصاف سے کام لے۔ عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کا حکم کسی کی خواہشات پر چلنے کی کلی نفی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت اس آیت میں فرمادی:

﴿وَلَا تَأْكُلُوٓاْ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُواْ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ لِتَأْكُلُواْ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[31]

"اور اپنے آپس میں اپنے مالوں کو ناحق نہ کھاؤ، اور ان کو حکام کی طرف ڈالو، تاکہ تم گناہ کے ساتھ لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھا جاؤ اور تم تو جانتے ہو"۔

عدل میں حرص یا خواہشات کا خواہ وہ اپنی ہو یا کسی اور کی، کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے اور حاکم کو شہادتوں کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ تاریخ کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نظام عدل کا قیام حکومتوں اور سلطنتوں کی مضبوط مستحکم قوت کی بنا پر معرضِ وجود میں آیا۔ نظامِ معدلت کو قائم کرنے کے لیے ایک مضبوط اور پائیدار حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ تمام اربابِ خیر فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں جو اُنہیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور مخاصمت باہمی میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر ذی اقتدار افراد نہ ہوں تو عالم میں شخصی انار کی پھیل جائے اور تہذیبِ اجتماع کا شیرازہ بکھر جائے۔[32]

اسی رہبر اور حاکم کی طرف قرآنِ مجید میں اشارہ فرمایا گیا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْآخِرِ﴾[33]

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اپنے حکمرانوں کی۔ پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اسے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور رجوع کرو، اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو"۔

مسلم قائد کی خصوصیات:

قیادت کے لئے کسی قائد کا تقرر ایسا عمل ہے جو عقل کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ جو مختلف صاحب منصب شخص کرتا ہے، اور جو ذمہ داری اس کے سپرد ہوتی ہے کہ عوام کو محفوظ رکھے اور ان کی ترقی و کمال کے لئے جدوجہد کرے، تو ایسے افراد کی کچھ شرائط ہونا چاہئیں تاکہ رسول اللہ ﷺ کی مسند پر بیٹھ کر قیادت کر سکیں، اور اگر ان میں ایسی شرائط نہ پائی جاتی ہوں تو وہ لائق قیادت نہیں۔ ہر معاملے میں صرف وہی شرط اختیار کی جاسکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے پیش کی گئی ہو، اس بناپر کسی شخص کے قائد قرار پانے کی بناء بھی اللہ کی مقرر کردہ شرائط ہوں گی نہ کہ انسانوں کی پیش کردہ شرائط۔ کسی شخص کے قائد قرار پانے کے لئے کتاب وسنت سے درج ذیل شرائط ہمارے سامنے آتی ہیں۔

عقل:

قائد کے لئے جو سب سے اہم صفت ہے وہ ہے ''عقل'' اس سے پہلے کہ قائد کے لئے عقل کی اہمیت کو بیان کیا جائے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت میں عقل کسے کہتے ہیں۔

قائد کے لئے صفت عقل بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ایک عام انسان کی بنسبت امیر کے لئے زیادہ عقلمند ہونا اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ اپنے منصب کی وجہ سے عوام کی رعایت کر سکے تاکہ عوام کا دنیا اور آخرت میں فائدہ ہو۔ اور قائد کے لئے عقل اس وجہ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اسی عقل کی وجہ سے امیر میں تجربہ، فکر اور تدبیر کی صفت کا ملکہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے وہ تاریخ کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر سکتا ہے اور تجربہ لوگوں کی رائے کو تلاش کر سکتا ہے اور اہل رائے سے زیادہ سے زیادہ مشورہ کر سکتا ہے۔ اسی لئے عاقل اور مجنون میں فرق یہ ہے کہ مجنون کے دل میں جو بات آتی ہے وہ کہہ دیتا ہے جبکہ عقلمند بہت احتیاط اور حفاظت سے گفتگو کرتا ہے اگر حکمت کو دیکھا جائے تو حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں کلام ہو اور حکمت مظاہر عقل میں سے ایک عظیم مظہر ہے اللہ تبارک وتعالی نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾[34]

''اور جسے دانائی عطا کی جائے تو بلاشبہ اسے بہت زیادہ بھلائی دی گئی اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلوں والے ہیں''۔

حکمت کی دو قسمیں ہیں: حکمت نظری اور حکمت عملی، حکمت نظری کی یہ تعریف ہے کہ بشری طاقت کے مطابق حقائق اشیاء کا اس طرح علم ہو جس طرح وہ اشیاء واقع میں ہیں، اور حکمت عملی یہ ہے کہ انسان برے اخلاق کو ترک کرے اور اچھے اخلاق کو اپنائے، اور ایک تعریف یہ ہے کہ بشری طاقت کے مطابق اللہ تعالی کے اخلاق سے متخلق ہونا ، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام احکام پر عمل کرنا اور آپ کے تمام افعال کی اتباع کرنا حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں، اگر اس کا تعلق ایک فرد کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو تہذیب اخلاق کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک خاندان کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اسے تدبیر منزل کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک شہر یا ملک کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو سیاست مدینہ کہتے ہیں۔[35]

حکم کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کو حکم اور علم عطا فرمایا، مجاہد نے کہا یعنی نبوت سے پہلے عقل اور علم عطا فرمایا[36] ۔

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾[37]

''اور ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی اور اسے حکمت اور فیصلہ کن گفتگو عطا فرمائی''۔

''الْحِكْمَةَ '' کے مفہوم میں نبوت، کتاب اللہ کا علم اور معاملات کی فہم و فراست، سب چیزیں شامل ہیں اور ''وَفَصْلَ الْخِطَابِ '' سے مراد ہے مقدمہ سن کر صحیح، واضح اور دوٹوک فیصلہ کرنا۔ ''وَفَصْلَ الْخِطَابِ ''میں یہ بھی شامل ہے کہ لمبی بات کو مختصر الفاظ میں ایسے طریقے سے بیان کیا جائے کہ ہر شخص کو پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ ان دونوں چیزوں کے لیے اعلیٰ درجے کی عقل اور فہم و فراست کے ساتھ قادر الکلام ہونا بھی ضروری ہے[38]۔

ابوالاعلی مودودی بیان کرتے ہیں: ''حکم ''کے معنی قوت فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ پس اللہ کی طرف سے کسی بندے کو حکم عطا کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانی زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی عطا کی اور اختیارات بھی تفویض فرمائے''[39]۔

حضرت یوسف کو ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہونچانا، اس کی بعد علم و حکمت کی بات کرنا اس امر کي واضح دلیل ھے سہ حاکم وقت میں عقل و شعور اور دانش کا ہونا لازمی جزء ہے۔

علم:

قائد کی صفات میں سے ایک صفت علم ہے اور یہ صفت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے اور یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو کسی کو اجتہاد کا اہل بنا دیتا ہے۔ امام ماوردی امامت کی شروط بیان کرتے ہو لکھتے ہیں کہ

''والثانی العلم المؤدی إلی الاجتھاد فی النوازل والاحکام[40]''

''اور دوسرا وہ علم ہے جو نوازل اور احکام میں اجتہاد کی طرف پہنچا دیتا ہے''۔

مزید آگے لکھتے ہیں:

''وإذا کان ھذا فی منصب الامامة العظمی شرطا فإنه کمال فی حق کل انسان فضلا عمن یکون امیرا[41]''

''اولوالامر کے لیے صفت علم میں اجتہاد کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے تاکہ وہ روزمرہ کے جدید معاملات اور سیاست کو پہچان سکے جن کا ایک مجتہد محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ دین و دنیا کے معاملات کو حکمت کے مطابق چلا سکے''۔

پھر مجتہد کے لئے بھی بہت سے امور ضروری ہیں جن کو امام غزالی اپنی کتاب "المستصفی "میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"وله أى المجتهد شرطان أحدهما أن يكون محيطا بمدارك الشرع من استشارة الظن بالنظر فيها وتقديم ما يجب تقديمه وتاخير ما يجب تاخيره ، والشرط الثانى أن يكون عدلا مجتنبا للمعاصى القادحة فى العدالة"

اسی طرح ابن الأرزق بادشاہ وقت کے لئے صفت علم کی دو وجوہ لکھتے ہیں:

" أحدهما أن افتقاره إليه فى الاحكام تحوجه إلى معرفته بها ليكون على بصيرة فى تنفيذ الفصل فيها وإلزام الوقوف عند حدودها ، والثانى أن تحليته بالعلم من اعظم ما يتحبب به إلى الرعية لما رسخ فى النفس على الجملة من فضيلة العلم ومحبة من انتسب إليه وإذا عرى منه فرط فى العمل بمقتفى السؤال عنه "﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا﴾[42]

اور جب وہ پختگی کی عمر کو پہنچے تو ہم نے ان کو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی 597ھ لکھتے ہیں ہیں: حکم کی تفسیر میں چار قول ہیں:(1) مجاہد نے کہا حکم سے مراد فقہ اور عقل ہے۔(2)ابن السائب نے کہا حکم سے مراد نبوت ہے(3) زجاج نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو حکیم بنادیا گیا اور زجاج نے کہا ہر عالم حکیم نہیں ہوتا حکیم وہ عالم ہوتا ہے جو اپنے علم کو استعمال کرے اور اس سے جہل کا استعمال کرنا ممتنع ہو۔(4) ثعلبی نے کہا حکم سے مراد ہے صحیح اور درست بات کہنا ارباب لغت نے کہا عرب کے نزدیک حکم وہ قول ہے جس میں جہل اور خطاء نہ ہو اور نفس جس چیز کی خواہش کرے اور اس میں ضرر ہو تو وہ اس خواہش کو رد کردے اور اسی وجہ سے حاکم کو حاکم کہتے ہیں کیونکہ وہ ظلم اور کج روی سے روکتا ہے۔اور علم کی تفسیر میں دو قول ہیں:(1) فقہ(2)خواب کی تعبیر کا علم[43]۔

علامہ قرطبیؒ نے کہا اگر ان کو بچپن میں نبوت دی گئی تھی تو اس سے مراد ہے ان کے علم اور فہم میں زیادتی فرمائی[44]۔

شجاعت:

قائد کی صفات میں سے ایک صفت شجاعت ہے۔اگر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ بہادر تھے۔ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

"كان رسول الله ﷺ أحسن الناس وأشجع الناس[45]"

"نبی کریم ﷺ لوگوں میں سے سب سے زیادہ حسین اور سب سے زیادہ بہادر تھے"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"کنا إذا حمی الوطیس واشتدت الحرب واحمرت الحدق نتقی برسول اللہ ﷺ و لیس رجل اقرب إلی العدو منہ [46]"

صفت شجاعت قائد کے لئے کیوں ضروری ہے اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے ابن الارزق لکھتے ہیں:

"من صفات الامامة النجدة لئلا یضعف عن إقامة الحدود ، وإقتحام الحروب فمتی کان الامام جبانا تحقر لضعفه ونشأ عنه مفاسد جمة ، وإذا ذاك فلا بد من ترفع مقامه عن الاتصاف بهذا الخلق الذمیم وتحلیة بضده اللائق بشریف منصبه ومکین رتبته"۔

قائد کے لئے صفت شجاعت کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کے بغیر امارۃ اور سیاست کی مصلحت مکمل نہیں ہوتی۔ابن تیمیہ کے قول سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے

ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"لا تتم رعایة الخلق وسیاستهم إلا بالجود الذی هو العطاء والنجدة التی هی الشجاعة بل لا یصلح الدین والدنیا إلا بذلك ولهذا کان لا یقوم بهما سلبه الأمر ونقله إلی غیره [47]"۔

اسی طرح ابن قیم لکھتے ہیں:

"والجبن خلق مذموم عند جمیع الخلق وأهل الجبن هم أهل سوء الظن بالله وأهل الشجاعة والجود هم أهل حسن الظن بالله [48]"

"اور بزدلی تمام مخلوق کے نزدیک برا وصف ہے اور بزدل لوگ اللہ کے ہاں برے گمان والے ہوتے ہیں اور بہادر اور سخی لوگ اللہ کے ہاں اچھے گمان والے ہوتے ہیں۔

اسی طرح "زادالمعاد" میں ابن قیم لکھتے ہیں

" فإن الشجاع منشرح الصدر ، واسع البطان متسع القلب ، والجبان أضیق الناس صدرا وأحصرهم قلبا لا فرحة ولا سرورا "[49]

اور ذہبی لکھتے ہیں:

"الشجاعة والسخاء أخوان ، فمن لم یجد بما له فلن یجود بنفسه "[50]

سخاوت:

قائد کی صفات میں سے ایک صفت سخاوت بھی ہے سخاوت کی اہمیت کے بارے مین علماء وصلحاء کے مختلف اقوال ہیں جس سے اھل السحاء کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قائد کے لئے صفت سخاوت کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"الجود حارس الاعراض"[51]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"السخاء ما کان ابتداء فاما ما کان عن مسئلة فحياء وتذمم"[52]

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں

"وقيل لحكيم أى فعل للبشر أشبه بفعل الله تعالى فقال الجود"[53]

"اور حکیم سے کہا گیا کہ انسان کا کون سا فعل اللہ کے فعل کے مشابہ ہے تو انہوں نے کہا کہ "سخاوت" ہے۔

خرائطی لکھتے ہیں

"ينبغي أن يكون المؤمن من السخاء هكذا وحثا بيديه[54]"

سید عفانی لکھتے ہیں

"السخي من كان مسرورا ببذله متبرعا بعطائه لا يلتمس عرض دنياه فيحبط عمله ولا طلب مكافاة فيسقط شكره ولا يكون مثله فيما أعطى مثل الصائد الذى يلقى الحب للطائر ولا يريد نفعها ولكن نفع نفسه"[55]

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ سخاوت کی کتنی اہمیت ہے تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ قائد کے لئے صفت سخاوت کتنی اہم ہے اور جب سلطان بخیل ہو گا تو وہ کسی کو بھی نصیحت نہیں کر سکے گا کہ تم بھی سخاوت کرو تو وہ سلطان ولایت کے نہیں بلکہ نڈیحت کا لائق ہو گا اس لئے اولوالامر کے لئے ضروری ہے کہ وہ صفت سخاوت کے حامل ہوں۔

حلم:

قائد کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امیر کے اندر حوصلہ، حلم اور بردباری ہونی چاہیئے کیونکہ سیاست کے لئے ہر وقت تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں 1: کاموں میں نرمی اختیار کرنا 2: ہر چیز میں صبر کرنا 3: خاموشی اختیار کرنا۔ حلم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ليس الخير أن يكثر مالك وولدك ولكن الخير أن يكثر علمك ويعظم حلمك"[56]

"بھلائی اس میں نہیں ہے کہ تیرا مال اور اولاد زیادہ ہو بلکہ بھلائی اس میں ہے کہ تیرا علم زیادہ ہو اور تیرا حوصلہ بلند ہو"۔

اسی طرح امام طبری لکھتے ہیں:

" بلغ عمر بن الخطاب رضی الله عنه أن جماعة من رعيته اشتكو من عماله فأمرهم أن يوافوه ، فلما أتوه قام فحمد الله واثنى عليه ثم قال أيها الناس أيتها الرعية إن لنا عليكم حقا النصيحة بالغيب والمعاونة على الخير أيتها الرعاة إن للرعية عليكم حقا فاعلموا انه لاشئ أحب إلى الله ولا أعز من حلم امام ورفقة"[57]

اسی طرح حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" لايبلغ العبد مبلغ الرائ حتى يغلب حلمه جهله ، وصبره شهوته ولا يبلغ ذلك إلا بقوة الحلم"[58]

"کوئی شخص رائے تک نہیں پہنچتا حتی کہ اس حلم اس کے جہل پر غالب آجاتا ہے، اور اس کا صبر اس کی شہوت پر غالب آجاتا ہے اور اور یہاں تک انسان صرف حلم کی قوت سے ہی پہنچتا ہے"۔

آدمی رائے تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کا حلم اس کے جحل پر غالب نہ آئے اور اس کا صبر اس کی شہوت پر غالب نہ آئے اور اس مقام پر وہ صرف حلم کے ذریعے ہی پہنچ سکتا ہے۔

عفو درگذر:

قائد میں عفو درگذر ایک ایسی صفت ہے جسے اس کے جمال اور رتبے کی عظمت کے لئے بیان کیا گیا ہے اور حاکم وقت کے لئے اس صفت سے بڑھ کر کوئی اور صفت مضبوط نہیں کیونکہ حاکم وقت سے عوام اور رعیت اس وقت ہی اچھا اور بہتر تعلق رکھتی ہے جب اس میں عفوودرگذر کی صفت ہو۔ قرآن کریم میں عفوودرگذر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے

" والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين"[59]

"اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے، اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے"۔

ایک اور مقام پر ہے

" وليعفوا وليصفحوا ألا تحبون أن يغفر الله لهم "[60]

"اور جب کوئی کسی کی غلطی کو معاف کر دیتا ہے تو اس کا اجر اللہ تبارک وتعالی کے پاس ہوتا ہے"۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے

" فمن عفا واصلح فاجره على الله "[61]

"جس نے درگذر کیا اور معاف کیا تو اس کا اجر اللہ کے پاس ہے"۔

نبی کریم ﷺ نے بھی عفو در گذر پر برانگیختہ کیا ہے آپ ﷺ کی بہت سی احادیث ہیں جو کہ عفو در گذر پر مبنی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

"جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، كم أعفو عن الخادم؟ فصمت رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال: يا رسول الله، كم أعفو عن الخادم؟ فقال: «كل يوم سبعين مرة»[62]"

"ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ آیا اور اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم خادم سے کتنا در گذر کریں آپ ﷺ خاموش رہے پھر اس نے دوبارہ وہی بات کی آپ ﷺ خاموش رہے جب اس نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ اسے معاف کرو"۔

اسی طرح حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" قال مانقصت صدقة من مال وما زاد الله عبدا بعفو إلا عزا وما تواضع أحد إلا رفعه الله[63]"

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا اور اللہ معافی کے ذریعے کسی بندے میں نہیں بڑھاتا مگر عزت کو، اور کوئی شخص اللہ کے لئے عاجزی نہیں کرتا مگر اللہ اس کے رتبے کو بڑھا دیتا ہے"۔

ان سب قرآنی آیات اور احادیث سے عفو و در گذر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور اگر امیر اور حاکم وقت میں صفت ہو تو اس کے بھی بہت سے فائدے ہیں مثلاً اگر امیر کے اندر عفو و در گذر کی صفت ہو تو لوگ اس کی وجہ سے اس سے محبت کریں گے اور اگر امیر سے عوام کو محبت ہو تو اس سے ملک ترقی کرتے ہیں۔

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾[64]

"اگر تو بد خلق، سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے، سو ان سے در گزر کر اور ان کیلئے بخشش کی دعا کر"

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خلق عظیم کے پیکر تھے، اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر ایک احسان عظیم فرمارہے ہیں کہ آپ کے اندر جو نرمی اور ملائمت ہے یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی کا نتیجہ ہے اور نہ نرمی، حاکم کے لیے نہایت ضروری ہے اگر آپ کے اندر یہ وصف نہ ہوتا بلکہ اس کے برعکس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تندخو، سخت دل، تلخ سخن ہوتے تو لوگ آپ کے قریب ہونے کے بجائے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دور بھاگتے۔ اس لیے آپ عفو و در گذر سے کام لیتے رہیے۔

اس سورۃ مبارکہ کی یہ آیت بھی بڑی اہم ہے۔ جماعتی زندگی میں جو بھی امیر ہو، صاحب امر ہو ،جس کے پاس ذمہ داریاں ہوں، جس کے گرد اس کے ساتھی جمع ہوں ،اسے یہ خیال رہنا چاہیے کہ آخر وہ بھی انسان ہیں، ان کے بھی کوئی جذبات اور احساسات ہیں، ان کی عزت نفس بھی ہے، لہٰذا ان کے ساتھ نرمی کی جانی چاہیے، سختی نہیں۔ وہ کوئی ملازم نہیں ہیں، بلکہ رضاکار (volunteers)

ہیں۔ آنحضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جو لوگ تھے وہ کوئی تنخواہ یافتہ سپاہی تو نہیں تھے۔ یہ لوگ ایمان کی بنیاد پر جمع ہوئے تھے۔ اب بھی کوئی دینی جماعت وجود میں آتی ہے تو جو لوگ اس میں کام کر رہے ہیں وہ دینی جذبے کے تحت جڑے ہوئے ہیں "لہٰذا ان کے امراء کو ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ یہ اللہ کی رحمت کا مظہر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے حق میں بہت نرم ہیں۔[65]

رفق:

نرمی اور رفق ایک ایسی صفت ہے جو کہ امراء کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ اگر امیر کے دل میں نرمی نہیں ہوگی تو لوگوں کے دل میں اس کے لئے محبت نہیں ہوگی جس کی وجہ سے ملک میں فساد اٹھ کھڑے ہوں گے۔ رفق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے امام بخاری نے حدیث مبارکہ نقل کی ہے:

"عن عائشة رضی الله عنها قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول اللهم من ولی من أمر امتی شيئا فشق عليهم فاشقق عليه ، ومن ولی من امر امتی شيئا فرفق بهم فارفق به[66]"

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یااللہ جو کوئی بھی میری امت کے کسی معاملے کا ولی بنا اور اس نے ان پر سختی کی تو تو بھی اس پر سختی فرما اور جو کوئی بھی میری امت کے کسی امر کا ولی بنا اور اس نے نرمی کی تو تو بھی اس پر نرمی فرما۔

اسی طرح صحیحین میں ہے کہ:

"عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ إن رفيق يحب الرفق[67]"

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نرمی فرمانے والا ہے اور نرمی کو پسند فرماتا ہے"۔

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

"أن النبی ﷺ قال إن الله عز وجل يعطی علی الرفق ما لا يعطی علی الخرق وإذا احب الله عبدا أعطاه الرفق وما من اهل بيت يحرمون الرفق إلا حرموا الرزق"۔

مذکورہ بالا تمام احادیث سے رفق کی اہمیت احسن طریقے سے واضح ہوگئی۔ جس سے یہ پتہ چلا کہ اولوالامر کے صفت رفق کا ہونا کتنا ضروری ہے۔

وعدہ پورا کرنا:

وعدہ پورا کرنا ایمان کے اخلاق میں سے ایک اہم خلق ہے اور امراء کی صفات میں سے بہت عظیم صفت ہے اور حاکم وقت اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ وعدے کو پورا کرے کیونکہ اس طرحکرنے سے اسکے منصب کے لئے جو رذائل چیزیں مخل ہیں وہ دور ہو جائیں گی۔

حاکم وقت کے مقام کو وعدہ خلافی سے دور کرنا ان امور میں سے ہے جن کا ضرور مطالبہ کیا جائے گا اور جن کے بارے میں تاکید کی گئی ہے۔قرآن کریم میں وعدہ پورا کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ :

"وأوفوا بعهدی أوف بعهدكم "[68]

"اور تم میرے وعدے کو پورا کرو میں تمہارے وعدے کو پورا کروں گا"۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے

"يأيها الذين امنوا أوفوا بالعقود"[69]

"اے ایمان والو وعدوں کو پورا کیا کرو"۔

اس کے علاوہ قائد کے لئے جو صفات ضروری ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ وہ صاحب بصیرت ہوں اور ان میں فیصلہ کرنے کی قوت ہو۔قرآن کریم میں ہے

﴿وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾[70]

"اور ہم نے اسے حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

اسی طرح امام بخاری نے کتاب الاحکام میں ایک باب یہ بھی لکھا ہے جس میں انہوں حضرت حسن بصری کے حوالے سے امیر کے اوصاف درج کئے ہیں اور لکھتے ہیں

"وقال الحسن اخذ الله على الحكام أن لا يتبع الهوى ولا يخشوا الناس ولا يشتروا بايتي ثمنا قليلا [71]"

"اور امام حسن بصری نے یہ کہا کہ اللہ تعالی نے حکام سے یہ عھد لیا کہ خواہش نفس کی پیروی نہ کریں اور لوگوں سے نہ ڈریں اور اللہ کے احکام کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لیں"۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک امیر کی کیا صفات ہیں :

"وقال مزاحم بن زفر قال لنا عمر بن عبد العزيزخمس إذا أخطأ القاضى منهن خصلة كانت فيه وصمة أن يكون فهيما حليما عفيفا صليبا عالما سؤالا عن العلم [72]"

''اور مزاحم بن زفر نے کہا کہ ہمیں حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا کہ خلیفہ کے لئے پانچ باتیں ضروری ہیں ان میں ایک بھی نہ ہو تو وہ عیب دار ہے وہ یہ ہیں کہ سمجھ والا ہو بردبار ہو بدکاری سے بچنے والا ہو حق وانصاف پر پختہ ہو عالم اور اہل علم سے بھی باتیں پوچھتا ہو''۔

یہ مفہوم کے اعتبار سے جس قدر عام ہے اپنی عملی ضرورت کے پہلو سے اسی قدر اہم اور خاص بھی ہے۔اس کا عام معنی تو واقعی انصاف ہے جبکہ عدل دراصل اس وصف کا نام ہے جس کا اظہار زندگی کے ہر پہلو میں ہونا چاہئے۔شب وروز کے معمولات، نشست وبرخاست، کلام وسکوت، معاشرتی ومعاشی مصروفیات، انفرادی واجتماعی معاملات، عائلی وسیاسی حالات وواقعات، اعتدال کی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں تاکہ کسی جگہ عدم توازن کی شکایت نہ ہو، زندگی کے ہر حصے کو اس کا پورا پورا حق مل رہا ہو تو وہ انصاف لائق تحسین اور ہر کسی کے لئے قابل تسلیم ہوتا ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾[73]

''اللہ تمہیں حکم کرتا ہے کہ امانتیں اہل کے سپرد کردو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔

''قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْقَاضِي مَا لَمْ يَجُرْ فَإِذَا جَارَ تَخَلَّى عَنْهُ وَلَزِمَهُ الشَّيْطَانُ''[74]

''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالی قاضی کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کرے جب وہ ظلم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور شیطان اس سے چمٹ جاتا ہے''۔

اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ﴾[75]

''ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف کتاب نازل کی ہے حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی کتابوں کی ان پر نگران ہے ان کے درمیان فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں''۔

قانون کی اس حکمرانی کی جھلک سرکار دوعالم، احمد مختار اور عرب وعجم کے تاجدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔عرب کے ایک معزز خاندان کی ایک بااثر خاتون نے چوری کی۔مقدمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ انصاف میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری فرمادیا۔اہل قبیلہ نے ذلت ورسوائی سے بچنے کے لئے سفارش کروائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ، أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الحَدَّ، وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا[76]

ترجمہ: ''پہلی قومیں اس لئے تباہ ہو گئیں کہ جب کوئی بڑا غلطی کا ارتکاب کرتا تو مختلف حیلوں، بہانوں سے سزا سے بچ جاتا اور جب کوئی عام انسان کسی فعل شنیع کا مرتکب ہوتا تو سزا پاتا، آپ نے فرمایا: اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔

اس واقعہ میں معمولی تفکر سے بھی ایک اہم نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ باپ بیٹی پر بہت ہی شفیق و مہربان ہوتا ہے اس کو جگر گوشہ اور جسم کا حصہ قرار دیتا ہے مگر جہاں اصولوں کی پاسداری کی بات آتی ہے تو وہاں تعلقات اور قرابت داری کو ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور حدود کے نفاذ میں کوئی پس و پیش نہیں کی جاتی۔ جب قائد اس قدر انصاف پسندی کا ثبوت دے گا تو وہ تنظیم، معاشرہ یا ملک امن و امان کا گہوارہ بن جائے گا۔ امام ماوردی بیان کرتے ہیں : دین کا تحفظ اس کے مستقل اصولوں اور سلف کے اجماع کے مطابق کرنا۔ اگر کوئی بدعتی یا شبہ میں مبتلا شخص اس سے روگردانی کرتا ہے تو اس کے سامنے دلائل واضح کرتا ہے اس کے حقوق و حدود کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے تا کہ دین ہر قسم کے خلل سے اور امت سے گمراہی سے محفوظ رہے۔ امیر کا کام یہ بھی ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں احکام نافذ کرے اور تنازعات کے فیصلے نمٹائے، تا کہ انصاف کا بول بالا ہو ظلم نہ ہو اور مظلوم کمزور نہ سمجھا جائے۔ حدود نافذ کرے تا کہ اللہ کے محارم کی حفاظت ہو اور بندوں کے حقوق ضائع ہونے سے محفوظ رہ سکیں[77]۔

عوامی رابطہ:

ایک اہم ذمہ داری جو قائد پر آتی ہے وہ یہ کہ عوام الناس کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ مثلاً ان پر ظلم نہ ہونے دینا، ان سے رابطہ رکھنا اور نگہبانوں کے ذریعے رکاوٹیں کھڑی نہ کرنا، عوام سے زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہنا، ان سے ٹیکس لیتے وقت ان کے حالات کو دیکھنا، ان کی مشکلات کو حل کرنے کے بارے میں سوچنا، اگر غلطی ہو جائے تو عوام سے معافی مانگنا وغیرہ۔

حضور کریم ﷺ کے اخلاق اس قدر بلند تھے کہ دوست تو دوست بد تر دشمن بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جانی دشمنوں کو معاف کر دینا ، غلاموں اور کنیزوں سے اچھا سلوک کرنا ، بیماروں کی عیادت کرنا ، کمزوروں اور ضعیفوں کو سہارا دینا اور اپنے پرائے سبھی کے ساتھ شفقت اور نرمی کا برتاؤ کرنے کی بے شمار مثالیں آپ ﷺ کی زندگی میں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر اپنوں سے حسن سلوک کی مثالیں تو بہت ملتی ہیں لیکن جانی دشمنوں کے ساتھ عفو و درگزر اور حسن سلوک کی جو مثال نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر قائم فرمائی اور فاتحین کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ حضور ﷺ کی قیادت میں اسلامی لشکر ابھی مکے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ ایک صحابی نے ابوسفیان کو پکڑ کر حضور ﷺ کے پاس لے آئے۔ یہ

ابوسفیا ن وہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ کی تھی اور حضور ﷺ کے بد ترین دشمن رہے تھے۔حضرت عمر نے ابوسفیان کو دیکھ کر حضور ﷺ سے اجازت طلب کی کہ اس دشمن اسلام کا سر اڑا دے لیکن رحمت عالم ﷺ نے انھیں سختی سے منع فرمایا۔ابوسفیان نے معافی طلب کی تو حضور ﷺ نے نا صرف ان کے سارے جرم معاف فرما دیے بلکہ یہ اعلان بھی فرما دیاکہ جو شخص ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے گا اسے بھی معاف کر دیا جائے گا ۔حضور ﷺ کا حسن سلوک دیکھ کر ابوسفیان مسلمان ہو گئے۔

"قَالَ عَمْرُو بْنُ مُرَّةَ لِمُعَاوِيَةَ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَا مِنْ إِمَامٍ يُغْلِقُ بَابَهُ دُونَ ذَوِي الْحَاجَةِ وَالْخَلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ إِلَّا أَغْلَقَ اللَّهُ أَبْوَابَ السَّمَاءِ دُونَ خَلَّتِهِ وَحَاجَتِهِ وَمَسْكَنَتِهِ فَجَعَلَ مُعَاوِيَةُ رَجُلًا عَلَى حَوَائِجِ النَّاسِ"[78]

"عمرو بن مرہ رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے جو بھی امام، حکمران ضرورت مندوں اور غریبوں کے لیے بندر کھتا ہے اللہ اس کے لیے آسمانوں کے دروازے بند کر دیتا ہے معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی ضروریات اور حاجات کے لیے آدمی مقرر کر دیا"۔

"قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِامْرَأَةٍ تَبْكِي عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ اتَّقِي اللَّهَ وَاصْبِرِي قَالَتْ إِلَيْكَ عَنِّي فَإِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِيبَتِي وَلَمْ تَعْرِفْهُ فَقِيلَ لَهَا إِنَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَتَتْ بَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَّابِينَ فَقَالَتْ لَمْ أَعْرِفْكَ فَقَالَ إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى"[79]

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں : نبی ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر پر بیٹھی رو رہی تھی آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ سے ڈر و صبر کرو۔اس نے کہاآپ پر وہ مصیبت نہیں آئی جو مجھ پر آئی ہے اس لیے کہہ رہے ہیں اس عورت نے آپ ﷺ کو پہچانا نہیں تھا کسی نے اس سے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں وہ آپ کے دروازے پر آئی تو وہاں کوئی دربان و چوکیدار نہیں پایااس نے کہامیں نے آپ ﷺ کو پہچانا نہیں تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا: صبر وہ ہے جو صدمہ پہنچتے ہی کیا جائے"۔

عوام کے مسائل حل کرنا:

حکمران کے لیے لازم ہے کہ عوام کے حالات سے واقفیت،ان کے فائدے میں امور سرانجام دے،ان پر نرمی و شفقت کرے،ان کی غلطیوں سے در گزر کرے،جو جس قسم کے فیصلے کا مستحق ہے عدل کے ساتھ وہ فیصلہ کرے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سلیمان علیہ السلام سے متعلق ذکر کیا ہے:

"وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ"[80]

"انہوں نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا کہ کیا ہو گیا مجھے ہدہد نظر نہیں آرہا وہ غائب ہے؟"

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر کو اپنے عوام کی حالت سے باخبر رہنا چاہیے جب سلیمان علیہ السلام کی نظروں سے ہدہد کا مسئلہ او جھل نہیں تھا تو بڑے معاملات کیسے او جھل ہو سکتے تھے؟[81]

"عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّهُ: سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ فِي أَهْلِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالخَادِمُ فِي مَالِ سَيِّدِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»، قَالَ: فَسَمِعْتُ هَؤُلاَءِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَحْسِبُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «وَالرَّجُلُ فِي مَالِ أَبِيهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»[82]"

"ابن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنی ذمہ داری کے لیے جوابدہ ہے۔امام اپنے عوام کے لیے، آدمی اپنے گھر کے لیے، نوکر مالک کے مال کے لیے جوابدہ ہے میرا خیال ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ آدمی اپنے باپ کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس کے لیے جوابدہ ہے"۔

یہی وجہ تعلیمات ہیں جن کی بنا پر حضرت عمر فاروق رعایا کی خبر گیری کے معاملے میں اتنے حساس نظر آتے ہیں کہ داؤد بن علی کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا:

"لو ماتت شاۃ علی شط الفرات ضائعة لظننت أن الله تعالی سائلي عنها يوم القيامة"[83]

ترجمہ: "اگر فرات کے کنارے بھیڑ کا بچہ (بھوک کی وجہ) بھی مر گیا تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے متعلق سوال کرے گا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح عمری "الفاروقؓ" میں رقم طراز ہیں کہ! تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمران دکھا سکتے ہو؟ جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں۔

کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے ہاں پانی بھر آتا ہو، فرش خاک پر سو جاتا ہو، بازاروں میں پھرتا ہو، جہاں جاتا ہو جریدہ و تنہا جاتا ہو، اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو، دور دربار، نقیب و چاؤش، حشم و خدم کے نام سے آشنا نہ ہو، اور پھر یہ رعب وادب ہو کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس طرف رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو، سکندر و تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا، عمر فاروقؓ کے "سفر شام" میں سواری کے اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا، چاروں طرف غُل پڑا تھا کہ "مرکز عالم" جنبش میں آگیا ہے۔

ملک کی حفاظت:

اللہ کا فرمان ہے:

"وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ"[84]

"مشرکین سے قتال کرو سب کے ساتھ کہ جب تک وہ تم سے لڑتے رہیں"۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً"[85]

"ایمان والو جو کفار تمہارے ساتھ لڑتے ہیں ان سے لڑو اور تم میں ان کے لیے سختی ہونی چاہیے"۔

اللہ نے متعدد آیات میں کفار سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے اس کا مدار و بنیاد امام پر ہے اس لیے کہ امام ہی فوجیں تیار کرتا ہے وہی دستے روانہ کرتا ہے۔ غنیمت وفیٔ تقسیم کرتا ہے معاہدے کرتا ہے اسی لیے علماء نے کہا ہے جہاد کا دار و مدار امام پر ہے اگر امام نہ ہو اور مصلحت کا تقاضا ہو تو جہاد کو مؤخر نہیں کیا جاسکتا۔ جو بہتر آدمی ہو وہ لوگوں کو اس مہم پر روانہ کر سکتا ہے[86]۔

"قَالَ رَجُلٌ لِلْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا: أَفَرَرْتُمْ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ حُنَيْنٍ؟ قَالَ: لَكِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَفِرَّ، إِنَّ هَوَازِنَ كَانُوا قَوْمًا رُمَاةً، وَإِنَّا لَمَّا لَقِينَاهُمْ حَمَلْنَا عَلَيْهِمْ، فَانْهَزَمُوا فَأَقْبَلَ الْمُسْلِمُونَ عَلَى الْغَنَائِمِ، وَاسْتَقْبَلُونَا بِالسِّهَامِ، فَأَمَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ يَفِرَّ، فَلَقَدْ رَأَيْتُهُ وَإِنَّهُ لَعَلَى بَغْلَتِهِ الْبَيْضَاءِ، وَإِنَّ أَبَا سُفْيَانَ آخِذٌ بِلِجَامِهَا، وَالنَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ: «أَنَا النَّبِيُّ لاَ كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ»"[87]

"براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے پوچھا تم لوگ حنین والے دن بھاگ گئے تھے؟ براء نے کہا اللہ کی قسم رسول ﷺ نہیں بھاگے بلکہ جلد باز قسم کے لوگ بھاگے تھے اور قبیلہ بنو ہوازن نے ان پر تیر برسائے تھے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے خچر پر تھے۔ سفید خچرنی پر تھے اور ابو سفیان بن الحارث رضی اللہ عنہ نے خچرنی کی لگام پکڑ رکھی تھی نبی ﷺ فرما رہے تھے میں نبی ہوں جھوٹا نہیں ہوں میں عبد المطلب کی اولاد ہوں"۔

"سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «انْتَدَبَ اللَّهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ، لاَ يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيمَانٌ بِي وَتَصْدِيقٌ بِرُسُلِي، أَنْ أُرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ، أَوْ أُدْخِلَهُ الجَنَّةَ، وَلَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ، وَلَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ»"[88]

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میرے پیچھے رہنے والوں کو میرے ساتھ نہ جانے کا دکھ ہوگا اور میرے پاس اتنی جنگی سواریاں ہیں نہیں کہ سب کو دیدوں تو میں کسی غزوہ سے کبھی پیچھے نہ رہتا اللہ کی قسم میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتال کروں اور شہید ہو جاؤں پھر زندہ ہو جاؤں پھر شہید ہو جاؤں پھر زندہ ہو جاؤ پھر شہید ہو جاؤں"۔

جہاد کے لیے دستے اور لشکر روانہ کرنا امیر کا کام ہے۔ امراء و عمال مقرر کرنا بھی امام کی ذمہ داری ہے—ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام کی ذمہ داری ہے سرحدوں کا تحفظ کہ دشمن کو اس طرح غلبہ حاصل نہ ہو کہ وہ عزتیں پامال کرے یا کسی مسلمان کا خون بہائے امام پر اسلام دشمنوں سے جہاد کرنا واجب ہے تاکہ اللہ کا دین تمام ادیان (باطلہ) پر غالب آجائے۔[89]

نتائج:

آج کا انسان اپنے اس احساس ذمہ ادری سے عاری ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے قیادت و سیادت کا مفہوم بالکل الٹ گیا ہے۔ اب قوم کا رہبر اس کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ اس سے خدمت وصول کرنے کے لیے اپنی عیاری اور مکاری سے کام لینا ہے۔ ٹھاٹ باٹ کے لیے بیت المال میں جمع قوم کا سرمایہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانیت سوز واقعات سامنے آتے ہیں۔ اقتدار کی ہوس اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ذہن میں سوال آتا ہے کہ اقتدار بھی کیا چیز ہے، جس کے لیے لوگ اپنے ضمیر کے خزانے لٹا دیتے ہیں۔

اب یہ بات رعایا کے ذمہ ہے کہ وہ اپنا ذمہ دار کسے چنتے ہیں اور اتنی بڑی ذمہ داری کس کے سپرد کرتے ہیں۔

دور حاضر میں قائدین کے طرز زندگی کا جائزہ لیں تو بلا دریغ کہا جاسکتا ہے کہ قوم کے مال کا بڑا حصہ غیر ضروری اخراجات اور جھوٹی شان و شوکت میں صرف ہو رہا ہے۔

آج اقتدار کی خاطر جنگ ہوتی ہے، جس کے حصول پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور عام انسانوں کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ بڑے بڑے فسادات بھی کروائے جاتے ہیں، جن میں ہزاروں لوگوں کے ارمان لٹ جاتے ہیں، جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور مکان خاکستر کر دیے جاتے ہیں۔

جبکہ پہلے لوگ قیادت کی باگ ڈور کو تھامنے سے ڈرتے تھے خود کو کمزور سمجھ کر ذمہ داری کا بار اٹھانے سے کتراتے تھے۔ کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ذمہ داری ٹھکرانے کی پاداش میں بادشاہوں کے عتاب کا شکار بھی ہونا پڑتا تھا۔

ذرا غور کریں کہ اگر قیادت و سربراہی کا وہی مفہوم آج بھی لیا جاتا جو پہلے سمجھا جاتا تھا اور جواب دہی کا تصور نگاہوں کے سامنے ہوتا تو لازماً قیادت کی جنگ کبھی نہ ہوتی اور ہم وہی دور دیکھتے جو خلافت راشدہ اور عمر بن عبد العزیز کا تھا۔ کاش ملت کے قائدین اس احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیتے۔ تو ہم ہرگز یہ نہ کہتے

مجھے رہزنوں سے گلا نہیں تیری رہبری کا سوال ہے

درحقیقت قائد کے لیے قیادت بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ بہت بڑی زمہ داری بھی اور بہت نیکی کا زریعہ بھی۔ قائد کی ایک اچھے کام سے پورے رعایا کی بھلائی ہوتی ہے تو پورے رعایا کی ثواب ملتا ہے۔ مگر قائد کی ایک غلطی بھی اسی طرح بہت گناہ و جواب دہ کا حامل ہوتا ہے۔

اسی بناپر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت ان اصولوں پر فرمائی، جن پر عمل کر دنیا کے اس مقدس جماعت نے نبی کریم ﷺ کے طور طریق بطور اسوہ اپنا کر ہر میدان میں فتح مندی کا وہ پرچم لہرایا دنیا جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔آیئے! ان اصولوں پر خود بھی عمل کریں اور دوسروں کو بھی ان اصولوں پر چلنے کی دعوت دیں۔

حوالہ جات

---

[1] النساء 59:4

[2] د/ أحمد مختار عبد الحميد عمر، معجم اللغة العربية المعاصرة،عالم الكتب، الطبعة الأولى، 1429 ھ، 2008ء،ج4،ص464

[3] اردو لغت (تاریخی اصول پر)،اردو لغت بورڈ، کراچی، جنوری 1996ء،ج14،ص386

[4] نور الحسن، مولوی، نور اللغات، نیشنل بك فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2006ء،ج2،ص831

[5] اردو لغت (تاریخی اصول پر)،اردو لغت بورڈ، ج14،ص123-124

[6] أحمد بن محمد بن على الفيومى، المصباح المنير في غريب الشرح الكبير، المكتبة العلمية، بيروت،ج2،ص518

[7] ابن منظور، محمد بن مكرم، لسان العرب، دار صادر بيروت، 1414ه،ج4،ص184، مادہ خلف

[8] سورة ص:26

[9] لسان العرب،2\206

[10] لسان العرب،5\252

[11] هود: 96

[12] لسان العرب،6\327

[13] الرحمن: 33

[14] لسان العرب،14\252

[15] المائدة 12:5

[16] لسان العرب،1\212

[17] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب العبد راع عن مال سیده، دار طوق النجاة، الطبعة الاولى:1422، رقم الحدیث:2558، ج3،ص150

[18] النساء 58:4

[19] أحمد بن حنبل، مسند أحمد بن حنبل، تحقيق شعيب الأرنؤوط ،الناشر: مؤسسة الرسالة الطبعة: الأولى، 2001م، رقم الحديث:12383، ج19،ص376

[20]تفہیم القرآن، مودودی، ترجمان القرآن، 1\189

[21] النساء :59:4

[22] المائدہ 44:5

[23]الشوری 38:42

[24] ال عمران 159:3

[25] مسند أحمد بن حنبل، رقم الحديث:18928، 31\244

[26] الدارمی، ابو محمدعبداللہ بن عبدالرحمن،سنن الدارمی، باب التورع عن الجواب فيما ليس فی كتاب ولا سنة، تحقيق: حسين سليم أسد الداراني ،الناشر: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، الطبعة: الأولى، 2000 م، رقم الحديث:119، 1\239

[27]المائدہ 8:5

[28]مفردات القرآن ،راغب اصفہانی، (مکتبۃ مرتضوية لإحياء الآثار الجعفرية)325

[29]السياسة الشرعية ص7

[30] مفاتيح الغيب ، فخرالدين رازى ،10520

[31] البقرۃ188:2

[32]الأحكام السلطانية" الماوردی:(ترجمہ سید محمد ابراہیم مطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، اشاعت 1931ء)ص:11

[33] النساء 59:4

[34]البقرۃ269:2

[35]تفسیر تبیان القرآن، غلام رسول سعیدی، فرید بک سٹال، ج1، ص342

[36]جامع البیان جز 12 ، ص 232231 ، مطبوعہ دارالفکر بیروت 1415ھ

[37] ص :20

[38]تفسیر القرآن الکریم ، عبدالسلام بھتوی ،دار الاندلس،ج1،ص342

[39] تفہیم القرآن، مودودی، ترجمان القرآن، ج1، ص189

[40] الماوردی،علی بن محمد بن محمد، الأحکام السلطانیہ ، دار الحدیث قاہرہ،ص 19

[41] ایضا ص 19

[42]سورۃ یوسف : 22

[43]زاد المسیر ج 4 ، ص 201 ، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ، 1407ھ

[44] الجامع لاحکام القرآن ، ج1،ص142

[45] صحیح بخاری ، باب الشجاعة فی الحرب، حدیث:2820، ج4،ص22

[46] مسلم، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، باب فی غزوة حنین، حدیث 76، ج3،ص1398

[47] ابن تیمیه ، مجموع الفتاوی ، 28/180

[48] الجوزی ـ ابن القیم ، الروسية ص 491

[49] الجوزی ، ابن القیم ، زاد المعاد ، 2/22

[50] ذهبی ، سیر أعلام النبلاء، 19/235

[51] الزمخشری، محمود بن عمر، ربیع الابرار ونصوص الاخیار ،مؤسسة الأعلمی للمطبوعات بیروت ،ج4،ص357

[52] ایضا، 480/4

[53] راغب اصفهانی،حسن بن محمد ، ص 287

[54] الخرائطی ، محمد بن جعفربن محمد ،مکارم الاخلاق ومعالیها ومحمود طرائقها،مکتبة الرشد،1427-2006،ص 179

[55] العفانی ، سید حسین ، صلاح الامة فی علو الهمة مؤسسة الرسالة –دار العفانی 19971417،ج2،ص617616

[56] البیهقی، احمد بن حسین بن علی بن موسی ، الزهد الکبیر ، دار الجنان مؤسسة الکتب الثقافیه ،ص276

[57] الطبری ، ابو جعفر، محمد بن جریر، تاریخ الطبری،دار المعارف بمصر ،ج4،ص224

[58] ابن ابی الدنیا، عبد الله بن محمد بن عبید ، الحلم ، مؤسسة الکتب الثقافیة ، بیروت ، 1413ھ، ص2625

[59] ال عمران 3:134

[60] النور ، 22

[61] الشوری ، 40

[62] سنن الترمذی، باب ما جاء في العفو عن الخادم،حدیث 1949، ج4،ص336

[63] سنن الترمذی، باب ماجاء فی التواضع،حدیث 2029، ج4،ص376

[64] ال عمران 3:159

[65] تفسیر بیان القرآن، اسرار احمد

[66] صحیح مسلم، باب فضیلة الامام العادل، حدیث: 1828، ج3،ص1458

[67] صحیح مسلم، باب فضل الرفق، حدیث:2593،ج4،ص2003

[68] البقره 2:40

[69] المائده 5:1

[70] ص .20

[71] صحیح بخاری، باب متی یستوجب الرجل القضاء، ج9،ص67

[72] ایضا

[73] النساء 58:4

[74] الترمذی، محمد بن عیسی،سنن الترمذی، باب ماجاء فی الامام العادل،شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابي الحلبي مصر الطبعة: الثانية، 1395 هـ 1975 م،حدیث نمبر 1330، 3\610

[75] سورۃ المائدہ، 48

[76] صحیح بخاری،ج4،ص175

[77] الماوردی، احکام السلطانیہ، 1615

[78] سنن الترمذی، باب ما جاء فی امام الرعیۃ، ج3،ص311

[79] صحیح بخاری، باب زیارۃ القبور،ج2،ص79

[80] النمل 20:27

[81] تفسیر القرطبی،ج13،ص188

[82] صحیح بخاری، باب العبد راع في مال سيده، ولا يعمل إلا بإذنه،ج3،ص120

[83] حلية الأولياء ،أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني،دار الكتاب العربي ،بيروت،الطبعة الرابعة ، 1405،ج1،ص53

[84] التوبۃ 36:9

[85] التوبۃ 123:9

[86] المغنی،ج8،ص153152

[87] صحیح بخاری، باب من قاد دابة غيره في الحرب،ج4،ص30

[88] صحیح بخاری، باب الجهاد من الایمان،ج1،ص16

[89] الاحکام السلطانیہ،16